ہسکتھ پیرسن

برنارڈ شا ــــ ڈرامہ نگار

جارج برنارڈ شا ڈبلن میں جولائی ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا، اس وقت وہ ۹۰ سال کا ہے، اور "ایپل کارٹ" (مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء) یا "جینیوا" (مطبوعہ سنہ ۱۹۳۸ء) کی طرز کا ایک طربیہ ڈرامہ لکھنے میں مصروف ہے، جارج برنارڈ شا گوشت بالکل نہیں کھاتا، وہ نہ سگرٹ پیتا ہے نہ شراب۔ اسے صرف کام کرنے میں مزا آتا ہے۔ ڈرامہ نویسی کے علاوہ پبلک تقریریں — پمفلٹ - مباحثے - ملاقاتیں - جلسے اور تقریباً ہر موضوع پر اخباری مضامین شا کی زندگی کا مشغلہ رہے ہیں۔ شا سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلہ پر بڑے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کرتا ہے۔ اس کی معلومات بڑی وسیع ہے جس کا اظہار وہ اپنے ڈراموں میں کرتا رہتا ہے۔ شا کی شادی ۱۸۹۸ء میں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کا انتقال سنہ ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ المختصر جارج برنارڈ شا ایک غیر معمولی انسان ہے، جس کا صحیح مقام اس کی وفات کے بعد ہی معلوم ہوگا۔

شیکسپیر کی وفات کے بعد تقریباً تین سو سال تک برطانوی ڈرامہ پر مردنی چھائی رہی۔ کبھی کبھار کوئی شاہکار نظر آجاتا تھا۔ مثلاً گولڈ اسمتھ کا ڈرامہ "شی اسٹوپس ٹو کونکر" یا شیری ڈن کا ڈرامہ "دی اسکول فار اسکینڈل" یا وائلڈ کا ڈرامہ "دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ"۔ یہ سچ ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے آخر تک تھیٹر کو چوٹی کے ڈرامہ نگاروں کے بجائے دراصل بڑے بڑے ایکٹر چلا رہے تھے، سترھویں صدی میں اچھے ڈرامہ نگاروں کی قلت کا سبب ایک تو شیکسپیر کی ذات تھی، دوسرے "پیوریٹنزم" کا عروج تھا، اسی زمانہ میں ہنری فیلڈنگ کی ہجویات کے باعث آئندہ دو صدیوں تک مصنفوں نے ڈرامہ کو خیر باد کہا اور اپنی تمام توجہ ناول نگاری پر صرف کر دی۔

عہد وکٹوریہ کے آخری دور میں جو ڈرامہ نگار گذرے ہیں وہ فرانس کی تقلید کرتے تھے۔ جب برنارڈ شا ڈرامہ کی دنیا میں آیا تو برطانوی تھیٹر کا انحصار گھٹیا قسم کے طربیہ ڈراموں یا فرانسیسی ڈرامہ نگاروں اسکرائب اور سارڈو کے پلاٹ کو توڑ مروڑ کر نئے سرے سے لکھے ہوئے انگریزی ڈراموں پر تھا۔ سنہ ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک شا نے ایک ڈرامائی نقاد کی حیثیت سے اس دور کے ڈرامہ پر سخت تنقید کی۔ اس نے ابسن کی خوب خوب تعریف کی اور خود اپنے طربیہ ڈراموں کے لئے راستہ تیار کیا۔ اتفاقیہ طور پر شا نے اخبار نویسی کی تاریخ میں بعض بہترین مزاحیہ اور اشتعال انگیز مضامین تحریر کئے۔ برنارڈ شا کی تنقید کامیاب رہی اور بیسویں صدی کے آغاز میں شا کی طرز کے ناٹک نے انگلستان میں مضبوطی سے قدم جما لئے۔

سماجی طنز

شروع شروع میں لندن کے تھیٹروں کے مینیجروں نے شا کے ڈراموں کی کوئی قدر نہ کی۔ شا نے ان مینیجروں کو قصہ کہانیوں، باسی حکایتوں اور عام جذبات کے بجائے سماجی طنز - جدید فلسفہ اور عالمانہ مکالموں سے بھرپور ڈرامے مہیا کئے۔ شا کے ایک ابتدائی ڈرامہ پر لوگوں نے آوازے کسے۔ ایک دوسرے

Taj Tahir Foundation

ڈرامہ کو سنسر کیا گیا، اور ایک تیسرا ڈرامہ بالکل ناکام رہا۔ لیکن شاؔ نے ہمت نہ ہاری - اور سنہ ۱۹۰۴ء میں جب کورٹ تھیٹر میں اسے ڈرامے اسٹیج کرنے کا موقع ملا تو اس نے خود طربیہ ڈرامے لکھے، ایکٹروں کو خود تربیت دی اور اپنا ایک مخصوص حلقہ پیدا کر لیا - اس کے بعد یہ عالم ہوا کہ لندن کے تھیٹروں میں اس کے ڈرامہ کی مانگ بہت بڑھ گئی، لیکن ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ تک نقاد یہی کہتے رہے کہ شاؔ کے ڈرامے ڈرامے ہی نہیں ہوتے، کیونکہ خود شاؔ بھی اپنے ڈراموں کو طنزاً مکالمے، مباحثے اور تاریخ کے سبق وغیرہ بتایا کرتا تھا۔ جس وجہ سے برنارڈشا کا کام اس قدر عجیب معلوم ہوا وہ یہ تھی کہ اس نے ڈرامہ نویسی کی قدیم تکنیک کو زندہ کیا اور اس کا اطلاق جدید مسئلوں پر کیا۔ اس نے موجودہ زمانہ کے مسائل کو سلجھانے کے لئے یونانی ڈرامہ نگاروں کے طریقے اختیار کئے، سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شاؔ نے تھیٹر کو اس طرح استعمال کیا جیسے کوئی اخبار۔ ممبر پارلیمنٹ فارم سے کام لیتا ہے اس کے اکثر طربیہ ڈرامے کچھ آدھے وعظ و نصیحت اور آدھے بحث و مباحثہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اپنے ڈراموں میں اس نے محبت، شادی، گھریلو زندگی سے لیکر مذہب، سائنس اور سیاسیات تک پر بحث کی ہے جن میں اشتراکیت کا رنگ نمایاں ہے۔

چونکہ برنارڈشا پیدائشی ڈرامہ نویس ہے اس لئے وہ اپنے ڈراموں کا پلاٹ پہلے سے تیار نہیں کرتا، جب وہ اپنے ڈرامے لکھنے میں مصروف ہوتا تھا تو اسے کچھ پتہ نہ ہوتا تھا کہ اگلے صفحہ پر وہ کیا لکھے گا - ان ڈراموں کا انجام ناگزیر ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ ان پر مختی سے مختی فنکار کی طرح محنت کرتا تھا۔

شاؔ اپنے ابتدائی ڈراموں کو ناخوشگوار کہا کرتا تھا، اس کے ان ڈراموں کے موضوع مکروہ قسم کا نظام زمینداری، جذبۂ رقابت اور فحاشی کی مہلک بیماری تھے، اس کے بعد "خوشگوار" ڈرامے آئے جن میں سے "آرمز اینڈ دی مین" اور "یو نیور کین ٹیل" اب بلند پایہ طربیہ ڈرامے تسلیم کئے جاتے ہیں، اس کے بعد "تھری پلیز فار پیوری ٹنز" لکھے گئے - ان ڈراموں میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈرامہ لکھنے کے لئے جنسیات اور ہر دلعزیز موضوع نہیں اور نہ سزا اور انتقام کی حماقت ثابت کرنے کے لئے ان پر قلم اٹھانا ضروری ہے - ان میں سب سے بہتر "سیزر اور کلو پیٹرا" ہے جس میں قدرتی اور مزاحیہ انداز میں تاریخی شخصیتوں کے بیان، جدید ڈرامہ اور سوانح نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے -

تخلیقی ارتقاپسند

اس کے بعد شاؔ نے ایسے ڈرامے لکھنے کی کوشش ترک کر دی جو صرف اسٹیج کے لئے موزوں ہوں۔ بلکہ اس نے صرف وہ ڈرامے لکھے جو اس کی طبیعت کے مطابق تھے "مین اینڈ سپر مین" کے تیسرے طویل ایکٹ میں "تخلیقی ارتقاپسند" (کریٹو ایولیوشن اسٹ) کی حیثیت سے شاؔ کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے - "جان بلز اور آئی لینڈ" میں سیاسیات - "میجر باربرا" میں مکتی فوج - "ڈاکٹرز ڈائی لیما" میں پیشہ طبابت - "گیٹنگ میریڈ" میں شادی - "مس الائینس" میں والدین اور اولاد - "پگ ملین" میں صوتیات پر بحث کی گئی ہے، یہ ڈرامے یکے بعد دیگرے بڑی تیزی کے ساتھ شائع ہوتے رہے، مذہبی جور و ستم کے پردے میں جو سیاسی امور قابل تذکرہ تھے شاؔ نے انھیں سنہ ۱۹۱۳ء میں مکمل ترین ڈرامہ کی صورت میں شائع کیا مگر مذہبی نقادوں نے ناپاک اور بدمذاق بتا کر مسترد کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں شاؔ نے چیخوف کی طرز میں "ہارٹ بریک ہاؤس" لکھا - "بیک ٹو متھو صلح" میں اس نے نسل انسانی کے نام اپنی وصیت شروع کی جس میں اس نے اس ضرورت کا اظہار کیا کہ انسان کی عمر کم از کم تین سو سال ہونی چاہئے اور وہ جریہ بتائی کہ جب تک مردوں اور عورتوں کو موجودہ زمانہ کی بہ نسبت زیادہ عرصہ تک جینے کی امید نہ ہوگی، وہ سنجیدگی سے اپنے خیالات کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کریں گے - سنہ ۱۹۲۴ء میں "سینٹ جون" کی اشاعت سے برنارڈشا کی شہرت مسلم ہو گئی اور یہ ڈرامہ دنیا بھر میں کامیاب رہا - اس کے بعد اس نے کئی ڈرامے اور لکھے، لیکن ان میں سے کوئی ان ڈراموں کو نہ پہنچ سکا جو شاؔ نے ۱۹۲۶ء سے پہلے لکھے تھے، جبکہ اس کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔

Taj Tahir Foundation

روایت پرستی

شا کی جودت طبع کے علاوہ اس کے ڈراموں کی بڑی خصوصیت اس کی روایت پرستی ہے۔ اگرچہ جب پہلے پہل یہ ڈرامے شائع ہوئے تھے تو نقادوں نے انہیں بہت زیادہ ذہنی تخیل اور غیر ڈرامائی بتایا تھا، ایکٹروں کا خیال تھا کہ ان ڈراموں میں اچھا ایکٹنگ ہو ہی نہیں سکتا اور دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کیا سوچیں۔ اصل میں شا نے یوری پیڈیز اور مولیر کا ٹکنیک استعمال کیا۔ اس نے سیرت و کردار کی اس انوکھی تمیز کو زندہ کیا جو شکسپیر کے ڈراموں میں پائی جاتی ہے۔ اس نے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے لئے بہت زیادہ مؤثر پارٹ مہیا کئے۔ یہ پارٹ ایسے تھے جو تقریباً تین سو سال تک کسی مصنف نے نہ لکھے تھے۔ شا نے ان طویل، فصیح و بلیغ تقریروں کو اپنے ڈراموں میں سمو دیا جو ابتدائی ڈراموں کا ایک نمایاں پہلو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سترھویں صدی سے لیکر اب تک انگریزی زبان میں اعلیٰ پایہ کے ڈرامے صرف شا نے ہی قلمبند کئے ہیں۔ شا نے ایک ڈرامائی نقاد کی حیثیت سے شکسپیر پر اسی لئے اعتراضات کئے تھے کہ وہ جدید اسٹیج کو خود زندہ ڈرامہ مہیا کر سکے۔ جس طرح اپنے زمانہ میں شیکسپیر نے کیا تھا۔

تاہم دونوں ڈرامہ نگاروں کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ شیکسپیر نظم میں صرف انسانوں اور روح انسانی کا نقشہ کھینچا کرتا تھا، لیکن شا کا تعلق خیالات اور فلسفہ سے رہا ہے اور وہ لوگوں کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور ان کے دل پختہ یقین سے بھر دیتا ہے۔ ایک خالص فنکار اور ایک پیغمبر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ لیکن شا بھی تو ایک فنکار ہے اور اس نے اپنے ڈراموں میں کئی کرداروں کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس نے اپنی قوت مشاہدہ سے پورا پورا کام لیا ہے، اس نے غیر معمولی زیرکی سے لوگوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ان کی خصوصیات کو واضح طور پر نمایاں کر سکتا ہے، لیکن اس میں شیکسپیر کی لطیف بصیرت اور اپنی تخلیق میں گم ہو جانے والی قوت موجود نہیں، لیکن شا نے چند ایسی جگہ اپنے بعض کرداروں کو اپنی طبیعت کی کریم النفسی اور ذہانت کے رنگ میں رنگ دیا ہے، جہاں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

قصص الحق

مؤلفہ

الحاج سید نواب علی (سابق وزیر تعلیمات جوناگڑھ)

اس معرکتہ الآرا کتاب میں قصص قرآنی، تاریخی اور اثری شہادتوں اور راسخون فی العلم کی اقوال کی روشنی میں، محققانہ انداز میں دکھائے گئے ہیں، اور اسرائیلیات کی تاریکی دور کی گئی ہے۔ قصص قرآنی پر اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے جو بیک وقت مخالفان اسلام اور حق پسندوں کے لئے چراغ ہدایت کا درجہ رکھتی ہے۔

پہلی فرصت میں طلب فرمائیے، بہت تھوڑی جلدیں بچی ہیں

قیمت عہ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۵۷

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ افکار۔ بھوپال۔

ماہنامہ "قوم" دہلی کا

خاص نمبر!

ہندستان کے ممتاز فسانہ نویسوں کے شاہکار افسانے، وجد آور نظمیں، دلگداز غزلیں، گرانقدر تحقیقی مقالے، مشاہیر ادبا و شعراء کی تصاویر اپنے جلو میں لئے ہوئے آرٹ پیپر کے سہ رنگی سرورق کے ساتھ

یکم جولائی سنہ ۱۹۴۶ء

کو اپنی پوری انفرادی رعنائیوں اور سحر طرازیوں کے ساتھ

شائع ہو رہا ہے!

ضخامت ۲۵۰ صفحات — قیمت صرف عہ

مستقل خریداروں کو مفت — سالانہ چندہ ے

ملنے کا پتہ

منیجر ماہنامہ "قوم" لائبریری روڈ دہلی

نظرے خوش گذرے

افکار کی اشاعت سے خوشی ہوئی۔ دونوں شماروں کو دیکھ کر بحیثیت مجموعی آپ کی خوش سلیقگی کی داد دینے کو دل چاہتا ہے اگر ادارہ کی توجہ حسن ظاہری کے ساتھ رسالہ کی باطنی اور فنی خوبیوں کی طرف بھی اسی طرح مبذول رہی تو افکار کو اُردو کے ماہناموں کی صف اول میں بہت جلد ایک نمایاں جگہ مل جائیگی۔

علی جواد زیدی بی اے، ایل ایل بی۔

افکار کے دو پرچے ملے۔ اس توجہ کا شکریہ! افکار کے ابتدائی پرچے بھی معیاری ہیں، مضامین نظم ونثر کا تنوع بھی لائق ستائش ہے۔ خاص طور پر افکار کی ترتیب بالکل جدید ہے ___ اور آپ کے ترقی پسند رجحانات کی غمازی کرتی ہے افکار کے پہلے پرچہ ہی نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے

مخمور جالندھری

افکار نظر افروز ہوا۔ سبحان اللہ، شروع سے آخر تک پڑھا، مضامین نظم ونثر کی ترتیب مجھے بیحد پسند آئی، عہد حاضر کے بعد جدت پسند حضرات مغرب زدہ ہونیکی وجہ سے غزل سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ بعض رسائل میں مضامین نثر کو جن میں زیادہ تر تیسرے درجہ کے افسانہ ہوتے ہیں غزل ونظم سے مقدم رکھا جاتا ہے اور اچھی اچھی غزلوں کو بھی اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ گویا وہ عہد حاضر کی مردود صنف میں سے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا رسالہ اس بدعت سیئہ سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے۔

الم مظفر نگری

افکار کے ذکر کے بعد افکار دیکھنے کو ملا۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ "بطن ادب" سے "آفتاب تازہ" طلوع ہوچکا ہے، اپنے دامن میں ہزاروں تابندگیاں لئے ہوئے۔ افکار کی رعنائیاں نہیں معلوم نکھرنے پر کیا ہونگی۔

صاحبزادی نسیم سلیم چھتاری کے برعکس میرے نزدیک فلمی صنفیں ضروری ہیں، اگر فلم، ادب سے نزدیک نہیں تو کیا ہم قریب ترلانے کی کوششیں بھی نہ کرینگے۔؟ پریم چند عظیم بیگ، جوش، کرشن چندر کے علاوہ ممتاز مفتی اور کنھیا لال کپور کے ساتھ ساتھ مثلاً عصمت، شاہد لطیف وغیرہ ادب اور فلم کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی دماغی کاوشیں کوئی بہتر نتیجہ نہ پیدا کرینگی؟!

حمیرا ثاقب

میں افکار کو موجودہ دور کا صحافتی "تاج محل" کہتا ہوں، میری طفلانہ دعائیں اور جوان کامانہ کوششیں افکار کے ساتھ ہیں۔

محمد علی تاج

اپریل ۴۶ء

غالب سے ملئے!

پروفیسر احتشام حسین

جب دانتے کو جنت اور جہنم میں جانے اور روحوں سے ملنے کا موقع ملا تو اس کی رہنمائی روما کے مشہور شاعر ورجل نے کی تھی، اور جب ڈاکٹر اقبال نے مختلف سیاروں کی سیر کی اور روحوں سے ملاقات کا موقع پایا تو ان کی رہبری کرنے والے مولانا روم تھے، لیکن جب میرے لیے یہ صورت پیش آئی تو صرف میرا شوق میرا رہنما تھا، میں نہ جانے کس طرح اندھیرے گھپ میں راستوں سے ہوکر یک بیک روحوں کی اس دنیا میں پہونچ گیا جس میں میرے ملاقاتی بہت ہی کم تھے، لیکن جن میں سے بعض میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کیونکہ اپنی دنیا میں میں نے ان کی تصویریں دیکھی تھیں، بعض کو تو میں نے صرف اس لیے پہچان لیا کہ وہ جن گروہوں یا لوگوں کے ساتھ تھے یا جس قسم کی باتیں کر رہے تھے، ان کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہ ہوسکتا تھا۔ بہت سے انسانوں کی طرح میرے دل میں بھی یہ خواہش ہمیشہ پیدا ہوتی تھی کہ کاش ہم ان بڑے آدمیوں سے مل سکتے، جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنی نسل کے دماغ بنائے اور مرنے کے بعد بھی جن کا اثر قائم ہے مگر یہاں بھی ایک لمبی فہرست تھی مذہبی پیشواؤں سے لیکر خونخوار ظالموں تک کے نام تھے اس میں فلسفی عالم مقرر سپاہی شاعر اور ادیب سبھی تھے اس عالم ارواح میں اپنی فہرست کے اکثر لوگوں کو دیکھ کر میں متحیر رہ گیا کہ کس سے ملوں اور کس سے نہ ملوں مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس دنیا میں بہت دیر تک نہیں ٹھہر سکتا، پھر مجھے کچھ اب نظر آیا کہ ہر طرح کے لوگ مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں یعنی فلسفی ایک طرف ہیں فاتح دوسری طرف مذہبی بزرگ ایک جانب ہیں۔ سائنس کے ماہر اور موجد دوسری جانب، شعراء ایک سمت ہیں۔ اور ماہرین سیاست دوسری سمت، اس طرح کچھ آسانی سی معلوم ہوئی اور فطری طور پر میری نگاہ اسی راہ پر گئی جہاں شعراء تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں کی کوئی مشترک زبان بھی ضرور تھی جسے میں سمجھ نہ سکا، کیونکہ میں نے ایک طرف فردوسی ملٹن اور تلسی داس کو باتیں کرتے دیکھا، اور دوسری طرف شیکسپیئر، کالیداس، ہومر اور دانتے کو۔ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی مشترک زبان نہ تھی تو پھر یہ ایک دوسرے کی سمجھتے کیسے تھے، مشترک زبان کا خیال آتے ہی میرے دماغ میں ہندوستان کی زبان کا مسئلہ ابھرنے لگا۔ اور شاید میرا کچھ وقت ضائع ہوجاتا۔ لیکن یک بیک میں نے اپنے قریب سے مرزا غالب کو گذرتے دیکھا۔ اس دنیا میں ذہن اتنا صاف اور شبک سیر ہوتا ہے کہ ایک ہی لمحے کے اندر میرے دل میں غالب سے ملنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی اور پھر ان کا یہ شعر بھی یاد آگیا ؎

وال وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع ۔ راہ میں ہم ملیں کہاں ۔ بزم میں وہ بلائیں کیوں

لیکن دل نے کہا کہ اپنے پاس غرور و ناز کہاں ہے اور پاس وضع کا تو ذکر ہی نہیں۔ اگر میں اس وقت چوک گیا تو پھر کہیں واقعی ایسا نہ ہو کہ یہ بجلی کوند کر کسی طرف نکل جائے، اور میں "لب تشنۂ تقریر" رہ جاؤں، دماغ کے اندر یہ سارا معرکہ اتنی کم مدت میں گرم ہوکر ختم ہوگیا کہ غالب نے مشکل سے دو قدم طے کیے ہونگے اور پھر مجھ کو اس بزم میں اجنبی دیکھ کر ان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا جو لوں کے بھید جان لیتی تھی، جو گل کے پردے میں چاک جگر اور پیالۂ ساغر میں مشاہدۂ حق کا راز پا لیتی تھی، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، کہ کیا کرنا چاہیئے، لیکن مرزا غالب سے ملنے، انھیں دیکھنے، ان کی آواز سننے کی خواہش اس قدر خیال میں بسی ہوئی تھی کہ میں نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ غالباً میں نے آہستہ سے کچھ کہا بھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ غالب نے اسے ہرگز نہ سنا ہوگا، مجھے معلوم تھا کہ وہ اونچا سنتے ہیں، ان کا شعر بھی یاد آیا ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ۔ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

لیکن نہ تو مجھ میں زور سے بولنے کی طاقت اس وقت پیدا ہوئی اور نہ میں یہ طے کرسکا کہ سلام کے لیے کون سے

الفاظ استعمال کرنا موزوں ہوگا، میں نے غالب کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ بیحد خوش خُلق ہیں۔ اور اجنبی سے اجنبی آدمی سے جلد بے تکلف ہو جاتے ہوں گے، میں نے ان کے خطوں مین ایسے خط بھی پڑھے تھے جو بالکل انجان لوگوں نے ان کے پاس لکھے تھے، لیکن وہ ان کے جواب میں بھی بے تکلفی سے کام لیتے تھے، ان خیالات نے مجھے اس بے ساختگی کے ساتھ ان سے ملنے پر آمادہ کر دیا۔ سلام کرتے ہی غالب ٹھہر گئے اور مسکرائے، مین جھجک کے ساتھ انکی طرف بڑھا اور وہ خود بھی میری جانب بڑھے، ان کے چہرے مین کوئی ایسی خاص بات تھی کہ مین مرعوب ہوتے ہوئے بھی اپنے کو ان کا شناسا محسوس کرنے لگا۔ مسرت کی ہلکی ہلکی ترنگوں مین جھولا سا جھولنے لگا، جو میری اپنی دنیا مین کسی پسندیدہ انسان سے ملنے کے بعد میرے دل مین پیدا ہوتی تھیں، مین نے اپنا تعارف کرایا۔ نام کے علاوہ مین نے صرف اتنا اور کہا کہ مجھے آپ کی شاعری، آپ کی نثر، اور آپ کی شخصیت سے گہری دلچسپی ہے اور میری زندگی کا یہ عزیز ترین لمحہ ہے کہ مین آپ کو دیکھ رہا ہوں، اور آپ سے گفتگو کا فخر حاصل کر رہا ہوں، جس وقت مین یہ باتین کہہ رہا تھا مجھے غالب کی حاضر جوابی اور شوخ گفتاری کا خیال آیا اور دل نے کہا۔ دیکھوں، مرزا کیا کہتے ہین۔ میری بات جیسے ہی ختم ہوئی، مرزا غالب کی آنکھین جھک اٹھین اور بولے "جب سے مین نے وہ دنیا چھوڑی ہے ایسی باتین سننے کو ترس گیا۔ اس وقت بھی لوگ میرے پاس آتے تھے اور ایسی ہی باتین کرتے تھے، پھر شعر و سخن کی فرمائش کرتے تھے، تھوڑا سا وقت ہنسی خوشی میں کٹ جاتا تھا، یہان تو ہر شخص اپنی ہی کملی مین مست ہے اپنے مقابلہ میں کسی کو خاطر مین نہین لاتا، اچھا میاں تم یہاں کس کس سے ملے؟ مین نے کہا مرزا صاحب ابھی تو مین آپ کے سوا اور کسی سے نہین مل سکا ہوں، ویسے ملنے کی خواہش تو بہت سے لوگوں سے ہے، میں ذرا میر تقی میر سے بھی ملنا چاہتا ہوں، ان سے ملنے کی خواہش سب سے زیادہ ان کے اس شعر سے پیدا ہوئی ہے، ع پیدا کہاں ہین ایسے پراگندہ طبع لوگ ۔ افسوس تم کو میر سے صحبت نہین رہی اس افسوس کو مٹانے کا موقع ہاتھ آگیا ہے، لیکن کیا میر صاحب سے ملنا ممکن بھی ہوگا؟ مین جانتا تھا کہ مرزا کے دل مین خود میر صاحب کی بڑی عزت ہے اور وہ میری اس خواہش پر خوش ہونگے۔ لیکن مرزا غالب نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہ کیا۔ اور صرف اتنا کہا کہ ضرور ملیئے، ملیں گے کیوں نہین۔ لیکن ذرا پراگندہ طبع کا فرق ذہن مین رکھکر ملنا میری سمجھ میں آیا کہ اس وقت کسی اور کا تذکرہ چھیڑنا مناسب نہیں۔ مرزا غالب ہاتھ آگئے ہیں۔ تو انھیں سے بات چیت کر لینا چاہیئے، میں نے مرزا سے کہا، خیر اس وقت تو میں آپ ہی کی صحبت سے فیضیاب ہونا چاہتا ہوں یہ تو بتائے کہ یہاں ماہ و سال کا کیا حساب ہے، آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو دنیا چھوڑے ہوئے تقریباً چھیاسی سال ہو گئے، ؟ کہنے لگے۔ بھئی مجھے یہاں کچھ پتہ نہین چلتا کہ وقت کا کیا حساب ہے۔ مگر ہاں لوگ آتے رہتے ہین، ان سے معلوم ہو جاتا ہے، ابھی چند سال ہوئے ایک صاحب ڈاکٹر اقبال نامی آئے، ان سے مجھے اکثر باتین رہتی ہین میں نے بے اختیارانہ پوچھا ۔ کیا ڈاکٹر اقبال کہین قریب ہی رہتے ہیں؟ مرزا ہنسے اور کہنے لگے، تمہین اس دنیا کا اندازہ نہین۔ یہاں قریب اور دور کا کوئی مفہوم نہین کوئی بالکل پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو سکتا ہے اور کوئی بہت دور ہوتے ہوئے بھی بالکل قریب۔ مجھے متحیر دیکھ کر بولے، میاں تم اس جھگڑے میں کہاں پڑو گے، مجھے یہ بتاؤ کہ وہان میرے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے؟ میں نے دل میں کہا۔ دیکھو بڑے آدمیوں کے دل میں بھی یہ جاننے کی خواہش ہر وقت موجود رہتی ہے کہ لوگ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہین۔ غالب کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ امید افزا جواب کے منتظر ہین، میں نے کہا، مرزا صاحب، آپنے تو خود ہی کہا تھا۔ " ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے" بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہر قسم کے لوگ موجود ہین۔ کوئی اچھا کہتا ہے، کوئی بُرا، لیکن

Taj Tahir Foundation

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی "شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" اور وہ لوگ جو آپ کی زندگی میں آپ پر طنز کیا کرتے تھے، یا آپ کے متعلق یہ کہتے تھے،

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

آج کوئی ان کا نام لینے والا بھی نہیں ہے　　یہی نہیں

بلکہ اس وقت بھی جب کوئی آپ کی شاعری پر معترض ہوتا ہے تو لوگ اسے حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اسے احساس کمتری یا کسی اور قسم کی کمزوری کا شکار سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ خاموش ہو جاؤں، لیکن میں نے مرزا کی آنکھوں میں ابھی کچھ اور سننے کی پیاس دیکھی اس لیے خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے رک کر کہا، میری دنیا میں آجکل تنقید کا دور ہے، کوئی بات بغیر چھان بین کے مانی نہیں جاتی بہت سے علوم کی مدد سے صرف شاعری ہی نہیں شاعر کی زندگی کے واقعات کی جانچ پڑتال بھی ہوتی ہے، اسطرح اب عقیدت کی جگہ انصاف سے کام لیا جانے لگا ہے، آپ کی شاعری بھی طرح طرح کی کسوٹیوں پر پرکھی جاتی ہے اور نتیجے نکالے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا میرزا میری باتیں اسطرح غور سے سن رہے ہیں کہ گویا یہ باتیں ان کے لیے نئی ہیں اس تحیر کے عالم میں انھوں نے کہا۔ تمہاری باتیں خوب ہیں۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ عام طور پر میرے موافق اور مخالف کیا باتیں کہتے ہیں۔ خاص طور سے میں مخالفوں کی باتیں سننا چاہتا ہوں، میں نے کہا۔ مرزا صاحب میں نے عرض کیا نا کہ روز بروز آپ کی شہرت اور عزت بڑھتی جا رہی ہے، آپ کا اردو دیوان متعدد مطابع سے قیمتی اور اچھے اڈیشنوں میں چھپتا ہے اور کوئی شخص بھی جو اردو سے دلچسپی رکھتا ہے آپ کے کلام سے بے بہرہ نہیں ہے۔ غالب نے میری بات کاٹ دی اور پوچھا تم نے صرف میرے اردو دیوان کا ذکر کیا، کیا میرے فارسی کے اشعار لوگ پسند نہیں کرتے؟ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی اور غالب کا وہ فارسی شعر یاد آگیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جس کو میری شاعری سے لطف اٹھانا ہے، وہ میرا فارسی کلام دیکھے، اردو میں کیا دھرا ہے، وہ تو میرے لیے باعثِ ننگ ہے۔ میں نے سوچا لاؤ، صاف صاف ہی کیوں نہ کہدوں، مرزا صاحب آپکا فارسی کلام فارسی سے دلچسپی لینے والے پڑھتے ہیں، لیکن اب ہندوستان میں فارسی کے جاننے اور سمجھنے والے اتنے کم رہ گئے ہیں کہ ان کو کسی حالت میں زیادہ نہیں کہا جا سکتا، دنیا بدل گئی ہے جسے آپ اپنے لیے باعث ننگ کہتے تھے وہی اردو دیوان لوگوں کے کلیجوں سے لگا ہوا ہے، اور جس فارسی شاعری پر آپ کو ناز تھا، اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ اپنی ساری زندگی اس بات پر لڑتے رہے کہ ہندیوں کو فارسی میں مستند نہیں مانا جا سکتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج آپ کا شمار بھی انھیں ہندیوں میں ہونے لگا ہے، اور جب فارسی میں سند کی ضرورت ہوتی ہے تو عام طور سے لوگ ایرانی شعراء کے کلام سے سند لاتے ہیں۔ لیکن اصل وجہ فارسی سے ہندوستانیوں کی بیگانگی ہے، ہاں آپکے اردو خطوط بھی غیر معمولی مقبولیت کے حامل ہیں، ان میں صرف آپ کی اور آپ کے جاننے والوں کی نہیں سارے ہندوستان کی زندگی بے نقاب ہو جاتی ہے، اس وقت کوئی ایسا نقاد نہیں ہے جو آپ کے خطوط کی اہمیت سے انکار کر سکے اگر کبھی کوئی زبان سے کچھ کہنے کی ہمت کرتا ہے تو صرف آپ کی شاعری کے متعلق کہتا ہے یا آپ کی سیرت اور شخصیت کے متعلق، مرزا غالب نے کہا، میں یہی تو تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ معترضین میرے متعلق کیا کہتے ہیں۔ معترضین کے متعلق میں نے اتنا پڑھا اور غور کیا تھا۔ کہ مجھے مختصر جواب دینے میں دشواری سی معلوم ہوئی۔ لیکن صرف اس خیال سے میں نے بات کو بڑھنے نہ دیا۔ کہ دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا معترضین کئی طرح کے ہیں۔

TajTahir Foundation

بعض تو دہی پرانی باتیں دہرائے جاتے ہیں کہ غالب کے بعض اشعار بے معنی ہیں۔ کچھ سرقہ اور توارد کا الزام لگا کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن ان اعتراضات سے زیادہ اہم وہ اعتراضات ہیں جو بعض لوگ آپ کی شخصیت پر کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو صرف آپ کی شہرت سے جلتے ہیں۔ اور اپنے دل کے جلے پھپھولے آپ کو گالیاں دے کر پھوڑتے ہیں، کچھ لوگ اس پر معترض ہیں کہ آپ کو ہمیشہ روپیہ پیسہ کی فکر رہی ہے اور ساری عمر آپ نے اسی کی جدوجہد کی نذر کر دی، پھر کچھ لوگ آپ کے خلوص پر بھی حرف رکھتے ہیں کہ جب تک بہادر شاہ ظفر لال قلعہ میں رہے آپ ان کا راگ گاتے رہے۔ جب غدر کے بعد انگریزی حکومت قائم ہوئی آپ نے وہاں اپنی سلسلہ جنبانی کی اور بہادر شاہ ظفر کو بالکل بھلا دیا۔ میں نے دیکھا کہ غالب کی آنکھیں نم ہو کر دھندلی ہو گئیں، چہرے پر بہت سے جذبات نمایاں ہو کر مٹ گئے اور اسطرح کی سنجیدگی پیدا ہو گئی جو ان کے ذہن کی انتہائی گہرائی کا پتہ دیتی تھی، کہنے لگے تم کہہ چکے یا کچھ اور کہنا ہے، میں نے دل میں کہا، غالب یہ ضرور یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ سب اعتراضات میرے ہی ہیں میں نے ہی دوسروں کے نام سے انھیں پیش کیا ہے اسلئے میں نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر کہا، مرزا صاحب ایک بات اور عرض کر دوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو، یہ اعتراضات میرے نہیں ہیں میں نے خود بارہا ان کے جواب دیئے ہیں۔ لیکن آج میں خود آپ کی زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں، مرزا غالب بولے، اعتراض اعتراض ہی ہے، تم کرو یا کوئی اور اس لیے میں تو جواب دوں ہی گا، ہاں تم اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر کہیں تشنگی رہ جائے تو مجھ سے پھر سوال کر لینا۔ ان اعتراضوں کے متعلق تو کچھ کہتے ہوئے مجھے ہنسی آتی ہے، جو میری شاعری پر کیئے گئے ہیں۔ ان کا جواب خموشی ہے، لیکن میری ذات اور میرے خلوص کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے بارے میں البتہ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، تم نے پہلی بات یہی تو کہی تھی کہ میں نے ساری عمر روپیہ پیسہ کی فکر کی گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہ میں نے جینا چاہا، زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا چاہا جسکا میں حقدار تھا۔ اگر میں نے اس کے لیئے جدوجہد کی تو گویا بڑا قصور کیا، اگر میں نے ان امراء و شاہانِ وقت سے وظیفہ اور خلعت کی خواہش کی جنھیں میری توصیف کی ضرورت تھی تو گویا میں نے بڑا گناہ کیا، جب خاقانی، انوری، سعدی، عرفی، قدسی، صائب، کلیم، میر، سودا، اور ذوق نے یہی کیا تھا۔ تو انہوں نے ادب و شعر کی خدمت کی تھی اور جب غالب نے ایسا کیا تو اس نے بڑی غلطی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا زندگی میں سکون اور لطف کی جستجو کرنا کسطرح اخلاق یا انسانیت کے خلاف ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ میں نے مادی سکون کی اس تلاش کے باوجود کیسی مصیبت میں زندگی بسر کی۔ اگر کوشش نہ کرتا تو میرا کیا انجام ہوتا۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ میں ابتداء جوانی میں کس طرح پھولوں کی سیج سے اٹھا کر کانٹوں کے بستر پر ڈال دیا گیا۔؟ اگر میں نے بہتر زندگی بسر کرنے کی کوشش کی تو بڑی برائی ہوئی یہ آخر معترضین کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ انسان کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ وہ زندگی کی معمولی ضرورتوں کیلئے محتاج ہو۔ لیکن میں محتاج بنا دیا گیا تھا۔ میں نے اُسے مٹانے کی کوشش کی، میں نے جہاں سہارا دیکھا وہیں جدوجہد کی، جہاں امید کی کرن دکھائی دی ادھر ہی روشنی کی جستجو میں گیا۔ اس سے میرے خلوص پر شبہ ہے، کیسے اپنے ناانصاف معترضوں کو یقین دلاؤں کہ میری شاعری میں غم والم کا عنصر محض ذاتی یا انفرادی نہیں ہے، اس میں اُس ماحول کے غم والم کی ترجمانی ہے جو میں دلی کی بجھتی ہوئی شمع کے گرد دیکھ رہا تھا۔ میں اس زوال کی حقیقت کو سمجھتا تھا۔ لیکن آنے والی زندگی کے قدموں کی چاپ بھی مجھے سنائی دیتی تھی، اور اس کشمکش میں میں ایک کا ماتم اور دوسرے کا خیر مقدم کر رہا تھا اگر کوئی شخص میرے کلام کے اس جزو کو سمجھ لے تو وہ میرے خلوص پر معترض ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔

مرزا غالب کا جوش بڑھتا جاتا تھا، لیکن یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ جیسے مرزا کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہو، پہلے آواز مدھم ہوتی گئی پھر مرزا کی تصویر ماند

جائزے

رومانی نظریۂ محبت　　برنارڈ شا (ڈرامہ نگار)

نظرے خوش گذرے

Taj Tahir Foundation

محمد اصغر انصاری

رومانی نظریۂ محبت

یہ کہنا تو غالباً تاریخ کو جھٹلانا ہوگا کہ وہ محبت جسے ہم رومانی محبت کہتے ہیں اس کا عہدِ قدیم یا ازمنۂ وسطیٰ میں وجود نہ تھا، عہدِ قدیم کی سیکڑوں رومانی داستانیں آج بھی ہمارے سرمایۂ ادب میں موجود ہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی رومانی محبت کو شادی کا ایک بنیادی جزو قرار دے لینا صرف عہدِ حاضر ہی کی تخلیق ہے، اور عہدِ حاضر میں بھی صرف چند ترقی یافتہ ممالک ہی میں اس کا عام طور سے رواج ہے، دوسرے ممالک میں شادیوں کے ٹھہرائے جانے میں رومان کا کوئی دخل نہیں اور حیرت تو یہ ہے بالعموم وہی شادیاں زیادہ تر خوشگوار اور دیرپا ثابت ہوتی ہیں جن میں رومان کا بالکل دخل نہیں ہوتا!

بات یہ ہے کہ رومان پرست اپنے محبوب کو چند ایسی صفات ودیعت کر دیتا ہے جس کا دراصل محبوب حامل نہیں ہوتا وہ اس میں قوسِ قزح کے رنگوں کی آمیزش کرتا ہے، اور پھر ان جذبات پر محل تعمیر کرتا ہے جن کا سرے سے وہاں وجود ہی نہیں ہوتا۔ جب تک محبوب اس کی دسترس سے دور ہوتا ہے تب تک تو یہ رومانی آرائش و زینت خوب برقرار رہتی ہے لیکن محبوب کی قربتِ دائمی یا دوسرے معنوں میں شادی ان خیالی تزئین و آرائش اور ان بے بنیاد جذبات کی قلعی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ آپ کے علم میں خود سینکڑوں ایسی مثالیں ہوں گی جہاں انمل بے جوڑ رومانی شادیاں کامیاب اور خوش آئند ثابت نہ ہو سکیں، اور تلخ حقائق کے سامنے آتے ہی عشق کا بخار اتر گیا۔ بات یہ ہے کہ قربتِ دائمی کے بعد رومانی جوڑا ایک دوسرے کو اس کے صحیح رنگ میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور پھر صحیح رنگ میں دیکھنے کے بعد وہ ایک دوسرے کو اجنبی معلوم ہونے لگتے ہیں، اور وہ ذہنی مماثلت جو شادی سے پہلے کارفرما معلوم ہوتی تھی اب یکسر کافور ہو جاتی ہے، زندگی کی قدروں میں فرق معلوم ہونے لگتا ہے، زندگی کے معیار میں ہم آہنگی نہیں رہتی اور پورا جنسی و ذہنی پس منظر بدل کر رہ جاتا ہے۔

اس رومانی نظریۂ محبت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم شادی اور محبت کی گذشتہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ تاریخی اعتبار سے عہدِ وسطیٰ شادی کے نقطۂ نظر سے انتہائی تاریک عہد گزرا ہے اس لئے کہ عیسائیت نے ہر قسم کے جنسی مظاہرات کو چاہے وہ شادی کی شرعی حدود کے اندر ہی کیوں نہ ہوں بہت ہی ذلیل اور گری ہوئی نظروں سے دیکھا۔ یہاں یہ جان لینا بہت ضروری ہے ازمنۂ وسطیٰ سے بہت پہلے بھی مثلاً یونان اور روم کے کلاسیکل عہد میں شادی کے معاملہ میں رومان کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یونانی اور رومن مائیں اپنے گھر کی مالکہ اور بچوں کی رکھوالی پہلے ہوتی تھیں اور اپنے خاوند کی شریکِ حیات بعد میں، اس لئے کہ محبت کیلئے شوہر کہیں اور جبیں سائی کرتے تھے اور ان خوشگوار جنسی تعلقات کی تلاش میں رہتے تھے جو ایک حد تک گھر میں ناپید تھے، مردوں کے ایسا کرنے میں کوئی بے عزتی بھی نہیں سمجھی جاتی اور بے عزتی بھی کیوں سمجھی جاتی جبکہ جنسی خواہشات کا حسبِ مرضی پورا کرنا نہ تو گناہ ہی سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی جرم۔

عہدِ جاہلیت میں محبت یعنی جنسی جذبہ تو بالکل ہی قعرِ مذلت میں گر گیا اگرچہ چرچ کی تعلیم کے مطابق جس کا بہت زور شور سے شہرہ کیا جاتا تھا جنسی جذبہ کی آسودگی گناہِ کبیرہ سمجھی جاتی تھی مگر پھر بھی چرچ کے اکابرین اور ائمۂ مذہب سر سے پیر تک عیاشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پادری صاحبان اپنی ہی لڑکیوں کے ساتھ عیاشانہ زندگی گذارتے تھے۔ ۱۱۷۱ء سینٹ آگسٹائن

کے بڑے پادری صاحب کے صرف کنٹربری کے ایک گاؤں میں سولہ ناجائز بچے پائے گئے اور اسی طرح بلیج کے پادری صاحب کے سنہ ۱۲۷۶ء میں صرف پیسٹھ ناجائز بچوں کا پتہ لگ سکا!! یہ تو تعامل اور تعلیم کے نقطۂ نظر سے جنسی تعلقات شادی کے دائرے کے اندر بھی بہت مذموم سمجھے جاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ سرے سے تمام جنسی مظاہرات ہی معیوب تھے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شادی شدہ عورتوں سے ہوں یا غیر سے اور اصل میں یہ جنسی بے راہ روی صرف ردعمل تھا چرچ کی تعلیم کا = پوپ گری گری ہفتم کی تعلیمات کے بعد بھی جب کہ اس نے چرچ کو ان تمام ناپاکیوں سے پاک کرنیکی کوشش کی تھی - اور بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوا تھا تب بھی شادی اس قعر مذلت سے نہ ابھر سکی جس میں وہ گذشتہ تعلیمات کی بنا پر گر چکی تھی۔

ہمارے خیال میں رومانی نظریۂ محبت کی تخلیق وارتقا غنائی شعرا اور قصہ گویوں کی مرہون منت ہے۔ اور انہی لوگوں کے طفیل اصل میں ہم رومانی محبت سے روشناس ہوئے ہیں۔ رومانی محبت محبوب کو نہ صرف لاثانی اور یکتا بلکہ ناقابلِ حصول بنا دیتی ہے اور یہی رومانی محبت کی اصل روح ہے۔ محبت کرنے والے کے بے انتہا جذبۂ خود سپاری کی بنا پر محبوب کا رتبہ عبودیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور پھر قربِ جسمانی کے امکانات ایک حد تک بالکل ختم ہو جاتے ہیں محبوب کی لاحصولیت عبودیت اور ان جذبات کے امتزاج کی تحلیل و تشریح کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ چرچ نے جسمانی محبت کے نظریہ کو اس قدر گرا دیا تھا کہ قربِ جسمانی اور جذبۂ تکریم کا ہم آہنگ ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ اگر کسی سے جسمانی تعلقات تھے تو اس کے لئے عزت نہ تھی اور اگر دل میں عزت تھی تو جسمانی تعلقات ناممکن تھے اس لئے وہ محبت جس کے رومانی شعرا نے گیت گائے وہ بالکل بے داغ رہی اور اس میں عملی جنسی جذبات اور تعلقات کی آمیزش ناممکن رہی۔ جذبات کی غیر تسکینی کی بنا پر پھر ایسی زمین ہموار ہوتی چلی گئی جس پر اخلاق اور تمدن کی تکمیل اچھی طرح بار آور ہو سکتی تھی۔ روحانی عنصر تمام دیگر جذبات پر چھانے لگا یہاں تک کہ ایسا وقت آگیا جب کہ جنسی تعلقات اور تصوری محبت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی اور آج بھی اکثر لوگوں کے نظریہ کے مطابق یہ وسیع خلیج موجود ہے آج بھی بہت سے ایسے آدمی موجود ہیں جو اپنے ایک مخصوص نظریہ جنسی کی بنا پر عورت کے لئے جذبۂ تکریم اور جسمانی تعلقات کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے اور اسی بنا پر وہ مجبور ہیں کہ عورتوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیں ایک وہ جو قابل احترام و تعظیم ہیں اور ایک وہ جن سے جسمانی تعلقات قائم رکھنا ممکن ہو سکتا ہے، یہ وسیع خلیج جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے بعض لوگوں کے دل و دماغ پر تمام عمر اس بری طرح حاوی رہتی ہے کہ بعض اوقات شادی کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ نامرد ہیں اور جنسی تعلقات کے نا اہل! بھلا غور تو کیجئے کہ وہ کس طرح اس عورت کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ سکتے ہیں جس کو بصد احترام و تکریم گرجے میں صلیب کے سامنے لے گئے ہوں، ایسے لوگوں کی بیویاں پھر زندگی بھر دوشیزہ رہنے پر مجبور ہوتی ہیں!!

ہم نے اوپر کہیں روحانی عنصر کا ذکر کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ فرانس اور برکنڈی میں اس روحانی تصور جنسی پر غازیانہ محبت (Knightly Love.) ایک حد تک اثر انداز ہوئی، مرد غازی کے تصور محبت سے جنسی جذبہ کی آسودگی بالکل خارج نہ تھی، دلیری اور شجاعانہ جذبہ نے محبت کو عظمت ضرور بخشی، لیکن وہ اس کو جسمانی تعلقات سے بھی آزاد نہ کر سکے، محبت ان غازیوں کے ہاتھوں میں ایک جلال اور باعظمت کھیل ہو کر رہ گئی جس کے بعد میں خاص قواعد و ضوابط بھی وجود میں آگئے اور عدالتیں تک مقرر ہو گئیں۔ ان عدالتوں کے جو اس زمانہ میں تمام یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض قوانین تو انتہائی لچر اور بیہودہ تھے لیکن ان عدالتوں سے اس مخصوص نظریہ فکر کی بنا پر ایک فائدہ تو ضرور ہوا اور وہ یہ کہ لوگوں کے دلوں میں عورت کے لئے عظمت اور وقار ضرور پیدا ہو گیا اور اس طرح اس تحریک سے چرچ کی غلط تعلیمات کے خلاف بھی ایک ردعمل شروع ہو گیا۔

Taj Tahir Foundation

جو اس وقت موجود تھیں اور محبت گو ذہنی اور عقلی حدود کے اندر نہ رہ سکی لیکن رنگین اور شاعرانہ ضرور ہو گئی۔

——— یورپ میں یہ رومانی نظریۂ محبت گذشتہ صدی میں اپنے معراج کو پہنچ گیا اور شیلے بجا طور پر اس نظریہ کا پہلا مبلغ کہا جا سکتا ہے، شیلے نے محبت میں جذبات اور تصورات کی ایک دنیا کو خوابیدہ پایا اور انہیں خیالات نے اس کی شاعری کو اُجاگر کر دیا اور چار چاند لگا دیئے، اس نے مروّجہ بندشوں کی صرف مذمّت ہی نہ کی بلکہ کھلّم کھلّا ان تمام بندھنوں کے خلاف بغاوت بھی شروع کر دی جن کی بنا پر وہ اپنی اس دنیائے محبت میں آزادی سے نہ گھوم سکتا تھا جس پر معلّم اخلاق کا پہرہ تھا۔ اصل میں وہ پوری طرح آزادی سے ان جذبات کی تسکین چاہتا تھا جو اس کی شاعری کے محرک تھے، اس کے خیال میں محبت پر کسی قسم کی روک یا پابندی لگانا جرم تھا، لیکن شیلے نے اس مکمّل اجازت نامہ کی طلبی میں دو غلطیاں کیں۔ ایک تو یہ سوچنے میں کہ محبت کبھی کامل طور پر آزاد بھی ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ نہ سمجھنے میں کہ یہ زور یہ تیزی اور یہ شدّت احساس جس نے اس کی شاعری کو دنیائے ادب میں یہ اعلیٰ مقام دلایا، صرف رہین منّت تھا، ان پابندیوں، رکاوٹوں اور بندشوں کا جو اس پر عائد تھیں۔ اس کے راستہ میں اگر رکاوٹیں نہ ہوتیں تو وہ شاید آج اتنا عظیم المرتبت شاعر بھی نہ ہوتا۔ شیلے کی تمام شاعری ان ہی مروجہ رسمی بندشوں کی مرہون منّت تھی۔

اور اسی لئے شیلے کی شاعری خاص طور پر ان غم نصیبوں کو محبوب ہے جو اس کی طرح دُکھی ہیں اور جن کی محبت پر پابندیاں عاید ہیں۔ لیکن رومانی محبت صرف رومانی شعراء اور غازیوں کی ہی تخلیق نہیں ہے۔ گذشتہ صدی کے وسط میں یورپ میں جتنے ناول اور ڈرامے تخلیق کئے گئے ان سب کا مرکزی خیال صرف یہی تھا، ان ڈراموں اور ناولوں میں اس ذہنی کشمکش کی عکّاسی کی گئی، جو اس زمانہ میں لوگوں کے دماغوں پر مستولی تھی، بڑے بوڑھے اور والدین اپنی اولاد کی شادی کے معاملہ میں اپنے تجربہ اور فراست کی بنا پر اپنے ذاتی انتخاب پر مصر تھے اور نوجوان اپنے دل کے معاملہ میں کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ناول نویسوں اور شعرا کی تعلیمات نے ہی رائے عامّہ کی جگہ لے لی، پھر کیا تھا، یہ رومانی محبت جس کی شادی کے لئے ایک حادثہ سے زیادہ وقعت نہ تھی، اب شادی کے لئے ایک لازمی جزو کی حیثیت پا گئی۔ یہ زیادہ تر امریکہ اور انگلستان میں ہوا اور یہ دو ممالک ہی دنیا میں ایسے ہیں جنھیں ہمیشہ اپنی ذہنی آزادی پر ناز رہا ہے، لیکن اس رومانی نظریۂ محبت کے ارتقا کے دوش بدوش نئی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ وہ دو اشخاص جو ایک دوسرے سے شادی کر رہے ہوں، ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہوں، محبت کرتے ہوں اور ان کے طبائع میں مماثلت ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ جس زمین پر وہ اپنا مستقبل تعمیر کر رہے ہوں وہ بہت مضبوط ہو شادی صرف رومان ہی رومان نہیں ہے آجکل کے اس مادّی عہد میں اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لئے اچھوتے خیالات اور نرم و نازک خیالات جذبات سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں " رومانی محبت کے دور میں انسان اس دنیا میں حسین ترین اور لافانی خوشی کا حامل ہوتا ہے، وہ مرد اور عورت جو ایک دوسرے سے جذبات کی پوری شدّت کے ساتھ محبت کرتے ہوں وہ حقیقی معنوں میں گویا جنّت کے مکین ہیں اور انکی محبت آفریں زندگی سے ناواقف ہونا بھی ایک طرح کی بدنصیبی ہی ہے۔ سماج کا ایک ایسا نظام ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ یہ بے اندازہ مسرّت ہر فرد بشر کی ملکیت ہو سکے گو کہ یہ مسرّت زندگی کا صرف ایک جزو ہے، زندگی کا حاصل نہیں ہے۔

میرے خیال میں شادی اور رومان کے مسئلہ پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ آخر میں ہمیں ان غنائی شعراء کا مرہون منّت اور شکر گذار ہونا چاہیئے جنھوں نے محبت کو پرانی اور فرسودہ رسوم سے آزاد کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ زندگی میں شاعری اور محبت سے زیادہ بھی کچھ اور چیزوں کی وقعت ہے جن کے حاصل کرنے میں ہمیں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے۔

Taj Tahir Foundation